13085CH10

باب 10

غزل کا نیا دور

انجمنِ پنجاب کے زیرِ اثر نظم گوئی کی روایت کو جو استحکام حاصل ہوا اس کے اثرات ترقی پسند تحریک کے دور تک بدستور جاری رہے۔ غزل اس عرصے میں اگرچہ معتوب رہی لیکن حقیقت یہ ہے کہ بیسویں صدی کے نصف اوّل میں باوجود تمام نامساعد حالات کے غزل نہ صرف زندہ رہی بلکہ اس نے نئی کروٹ بھی لی۔ قدیم و جدید کے امتزاج سے غزل نے ارتقا کی نئی منزلیں طے کیں۔ افکار و تصورات کے ساتھ زبان و بیان اور آہنگ و مزاج کے لحاظ سے اس دور کی غزل گوئی نے اپنی نئی شناخت قائم کی، جہاں سے غزل کے ایک نئے دور کا آغاز ہوا اس لیے اس دور کو غزل کی نشأۃ الثانیہ کا دور بھی کہا جاتا ہے۔ اس سلسلے کے شعرا میں شادؔ عظیم آبادی، آرزوؔ، فانیؔ بدایونی، اصغرؔ گونڈوی، حسرتؔ موہانی اور جگرؔ مرادآبادی، بطورِ خاص قابلِ ذکر ہیں۔

شادؔ عظیم آبادی (1927-1846) : ان کا نام سید علی محمد تھا۔ وہ عظیم آباد میں پیدا ہوئے اور وہیں اُن کی تعلیم و تربیت ہوئی۔ جب انھوں نے شاعری کے میدان میں قدم رکھا تو یہ لکھنوی شاعری کے عروج کا زمانہ تھا۔ شروع میں شادؔ نے بھی اس رنگ کو اپنایا۔ جس کی وجہ سے ان کی شاعری میں تصنّع، تکلّف اور کسی حد تک سطحیت و سوقیت آ گئی تھی۔ تاہم جب انھوں نے سنبھل کر شعر کہنا شروع کیا تو وہ شاعری کے افق پر چھا گئے۔ شادؔ نے تغزل کے دامن کو وسیع کیا۔ ان کا اندازِ بیان منفرد ہے۔ شادؔ نے غزل کے علاوہ مرثیے اور مثنویاں بھی لکھی ہیں۔ نمونۂ کلام ؎

تمنّاؤں میں اُلجھایا گیا ہوں   کھلونے دے کے بہلایا گیا ہوں
ڈھونڈو گے اگر ملکوں ملکوں، ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم   تعبیر ہے جس کی حسرت و غم، اے ہم نفسو! وہ خواب ہیں ہم
یہ بزمِ مَے ہے، یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی   جو بڑھ کر خود اٹھا لے ہاتھ میں، مینا اسی کا ہے

ریاضؔ خیرآبادی (1934-1852/53) : ریاضؔ خیرآباد، ضلع سیتاپور میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم اپنے والد طفیل احمد سے حاصل کی۔ اسیرؔ اور امیرؔ مینائی سے اصلاح لی۔ بعد میں ریاضؔ نے گورکھپور میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ وہاں سے انھوں نے ’ریاض الاخبار‘، ’فتنہ‘ اور ’عطرِ فتنہ‘ نام کے اخبار جاری کیے۔

ریاض نے اردو غزل کو ایک نیا رنگ بخشا۔ شراب کی سرمستی اور سرشاری سے معمور اشعار کی کثرت کے لحاظ سے ریاض کو اردو کا حافظ کہا گیا ہے۔ انھوں نے شراب کو کبھی منہ نہیں لگایا مگر حیرت کی بات یہ ہے کہ اس کی کیفیات کے ہزاروں رنگوں سے شعری سرمائے کو مالا مال کیا۔ ان کے بہت سے اشعار ہماری یادداشت کا حصہ بن گئے ہیں۔

ساقی! مئے اَلَست کی بوتل اٹھا تو لا — اتری ہے آسمان سے جو کل، اٹھا تو لا
انگور میں تھی یہ مے پانی کی چند بوندیں — پر جب سے کھنچ گئی ہے تلوار ہوگئی ہے
چھلکائیں لاؤ بھر کے گلابی شراب کی — تصویر کھینچیں آج تمھارے شباب کی

آرزو لکھنوی (1872/73-1951) : ان کا نام سید انور حسین تھا۔ لکھنؤ کے رہنے والے تھے۔ آرزو نے فارسی اور اپنے زمانے کے دوسرے علوم کی تعلیم لکھنؤ میں پائی۔ خاص طور پر عروض اور قواعد میں مہارت پیدا کی۔

اس زمانے میں کلکتہ اور ممبئ میں تھیٹر کی متعدد کمپنیاں قائم تھیں۔ آرزو نے ان کے لیے کئی ڈرامے مثلاً 'متوالی جوگن'، 'دل جلی بیراگن' وغیرہ لکھے۔ انھوں نے فلموں کے لیے کچھ گیت بھی لکھے۔ 'نظامِ اردو' اردو زبان سے متعلق ان کا اہم رسالہ ہے۔ ان کے کلام کے چار مجموعے شائع ہوئے ہیں: 'فغانِ آرزو'، 'جہانِ آرزو'، 'بیانِ آرزو' اور 'سریلی بانسری'۔ 'سریلی بانسری' میں آرزو لکھنوی نے یہ اہتمام کیا ہے کہ اس میں عربی و فارسی کی کوئی ترکیب نہ آنے پائے۔ اسے آرزو کا امتیاز سمجھا جاتا ہے۔

آرزو لکھنوی کا شمار ان باکمالوں میں ہوتا ہے جنھوں نے لکھنوی غزل کے رنگ کو نکھارا اور اسے ایک نئی اور سادہ زبان دی۔ چند اشعار حسبِ ذیل ہیں۔

جو سخن اس زبان سے نکلا — تیر گویا کمان سے نکلا
یا چاہنے والے لاکھوں تھے — یا پوچھنے والا کوئی نہیں
ہاتھ سے کس نے ساغر پٹکا موسم کی بے کیفی پر — اتنا برسا ٹوٹ کے بادل، ڈوب چلا مے خانہ بھی
ہٹ اپنی اپنی بات کی ہے، دھیان اپنی اپنی آن کا ہے — ہم ہیں کہ تلے ہیں مرنے پر وہ ہیں کہ مٹائے جاتے ہیں

فانی بدایونی (1879-1941) : ان کا نام شوکت علی خاں تھا۔ وہ اسلام نگر، ضلع بدایوں میں پیدا ہوئے۔ انٹرنس تک کی تعلیم بدایوں میں حاصل کی۔ بی۔اے کا امتحان بریلی کالج سے پاس کیا۔ پھر ایم۔اے۔او کالج، علی گڑھ سے ایل ایل بی کی تکمیل کی۔ لیکن وکالت کے پیشے سے انھیں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ فانی بدایونی بچپن ہی سے شعر و سخن

کی طرف مائل تھے۔1926 میں وہ حیدرآباد چلے گئے۔ وہاں مہاراجا کشن پرشاد اور پرنس معظّم جاہ کے دربار سے وابستہ رہے۔ وہ خرابیِ صحت کی وجہ سے اکثر پریشان رہا کرتے تھے۔ آخری عمر میں بیوی اور جوان بیٹی کی موت سے انھیں سخت صدمہ پہنچا۔ حیدرآباد میں انھوں نے وفات پائی۔ ان کی شاعری میں احساسِ غم نمایاں ہے۔ اُن کی زبان بہت منجھی ہوئی ہے۔ اندازِ بیان نہایت دل نشیں ہے۔ ان کا بہت سا کلام تلف ہوگیا۔ جو کچھ بچا وہ 'باقیاتِ فانی' کے نام سے شائع ہوا۔

آنسو تھے سو خشک ہوئے، جی ہے کہ امڈا آتا ہے — دل پہ گھٹا سی چھائی ہے، کھلتی ہے نہ برستی ہے
اک معمّا ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا — زندگی کاہے کو ہے خواب ہے دیوانے کا
ذکر جب چھڑ گیا قیامت کا — بات پہنچی تری جوانی تک

سیمابؔ اکبرآبادی (1880/82 – 1951): ان کا نام سید عاشق حسین تھا۔ وہ آگرے میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کی ابتدائی تعلیم مقامی اسکول میں ہوئی۔ انھیں بچپن ہی سے شاعری کا شوق تھا۔ وہ داغؔ دہلوی کے شاگرد تھے۔ ان کا شمار زود گو شعرا میں ہوتا ہے۔ سیماب نے شاعری کی ابتدا غزل گوئی سے کی۔ بعد میں نظم گوئی کی طرف متوجہ ہوئے اور نظم نگاری میں اپنا ایک مقام بنایا۔ نظم نگاری میں ان کے موضوعات متنوع ہیں اور اصلاحی پہلو نمایاں ہے۔

سیمابؔ نے 'قصرِ ادب' کے نام سے ایک ادبی ادارہ بھی قائم کیا تھا جس کے تحت انھوں نے آگرہ سے ماہنامہ 'شاعر' نکالنا شروع کیا جو اب تک ممبئی سے نکل رہا ہے۔ سیمابؔ نے کراچی میں وفات پائی۔

عمرِ دراز مانگ کے لائے تھے چار دِن — دو آرزو میں کٹ گئے دو انتظار میں
فقط احساسِ آزادی سے آزادی عبارت ہے — وہی دیوار گھر کی ہے وہی دیوار زنداں کی
کہانی میری رودادِ جہاں معلوم ہوتی ہے — جو سنتا ہے اسی کی داستاں معلوم ہوتی ہے

حسرتؔ موہانی (1880/81-1951): ان کا نام سیّد فضل الحسن تھا۔ وہ قصبہ موہان، ضلع اناؤ میں پیدا ہوئے تھے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد علی گڑھ سے انھوں نے بی اے کی ڈگری حاصل کی۔ وہ طالب علمی کے زمانے ہی سے سیاست میں دلچسپی لینے لگے۔ جنگِ آزادی کے سرگرم مجاہدین میں اُن کا شمار ہوتا ہے۔ انگریزی حکومت سے 'کامل آزادی' کا تصور 1921 میں پہلی بار حسرتؔ ہی نے پیش کیا۔ برطانوی حکومت کی شدید مخالفت کی وجہ سے انھوں نے

بار بار جیل کی مشقتیں برداشت کیں۔ حسرت کی ادبی خدمات بھی قابلِ ذکر ہیں۔ انھوں نے 'اردوئے معلّیٰ' کے نام سے ایک رسالہ نکالا تھا جس کا شمار اردو کے اہم رسالوں میں ہوتا ہے۔ انھوں نے بہت سے شعرا کے انتخابات بھی شائع کیے۔

حسرت موہانی بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں۔ وہ اپنے کلام میں خوب صورت الفاظ، حسین تراکیب اور مترنم بحروں کا استعمال کرتے ہیں۔ عشقیہ جذبات اور احساسات کی ترجمانی میں انھیں کمال حاصل تھا۔ انھوں نے معاملہ بندی کے شعر بھی کہے ہیں۔ شاعری میں ان کا سلسلہ منشی امیر اللہ تسلیم اور نسیم دہلوی سے ہوتا ہوا مومن سے جا ملتا ہے۔ غزل کی صنف کو اس کا کھویا ہوا وقار اور مرتبہ عطا کرنے میں حسرت کا رول بہت نمایاں ہے۔

نہیں آتی، تو اُن کی یاد برسوں تک نہیں آتی — مگر جب یاد آتے ہیں تو اکثر یاد آتے ہیں
حُسنِ بے پروا کو خود بین و خود آرا کر دیا — کیا کیا میں نے کہ اظہارِ تمنّا کر دیا
اللہ رے! جسمِ یار کی خوبی، کہ خود بخود — رنگینیوں میں ڈوب گیا، پیرہن تمام
توڑ کر عہدِ کرم، نا آشنا ہو جائیے — بندہ پرور جائیے اچھّا، خفا ہو جائیے

یگانہ چنگیزی (1883/84-1956): ان کا نام مرزا واجد حسین تھا۔ یگانہ عظیم آباد میں پیدا ہوئے اور وہیں تعلیم پائی۔ اردو کے علاوہ انگریزی اور فارسی زبانوں پر بھی قدرت رکھتے تھے۔ وہ شاد عظیم آبادی کے شاگرد تھے۔ ابتدا میں یاس اور بعد میں یگانہ تخلص اختیار کیا۔ لکھنؤ میں انھوں نے ایک طویل عرصہ گزارا۔ ان کے مزاج میں انانیت بہت زیادہ تھی جس کی وجہ سے شعرائے لکھنؤ سے زبردست اختلافات رہے۔ لکھنؤ ہی میں انھوں نے وفات پائی۔

یگانہ کی شاعری میں ان کے مزاج کا تیکھا پن نمایاں ہے۔ ان کا تیکھا اور زندگی سے بھرپور لب ولہجہ آتش کی یاد دلاتا ہے۔ یگانہ نے غزلوں کے علاوہ رباعیاں بھی کہی ہیں جو 'ترانہ' کے نام سے شائع ہوئیں۔ ان کے چند شعر یہ ہیں۔

خودی کا نشّہ چڑھا، آپ میں رہا نہ گیا — خدا بنے تھے یگانہ، مگر بنا نہ گیا
چِتونوں سے ملتا ہے کچھ سراغ باطن کا — چال سے تو کافر پر سادگی برستی ہے
ہر شام ہوئی صبح کو اک یادِ فراموش — دنیا یہی دنیا ہے تو کیا یاد رہے گی
بلند ہو تو کُھلے تجھ پہ راز پستی کا — بڑے بڑوں کے قدم ڈگمگائے ہیں کیا کیا

اصغر گونڈوی (1884-1936): ان کا نام اصغر حسین تھا۔ گورکھپور میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد بہت دِنوں تک ملازمت کے سلسلے میں گونڈہ میں رہے اس لیے اصغر گونڈوی کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ اصغر نے شروع میں منشی

خلیل احمد وجدؔ بلگرامی سے اصلاح لی۔ بعد میں امیراللہ تسلیمؔ کے شاگرد ہوئے۔ وہ نیک طبیعت اور مذہبی مزاج رکھنے والے انسان تھے اور شاہ عبدالغنی منگلوری کے مرید تھے۔ تصوّف کی طرف جھکاؤ ہونے کی وجہ سے ان کی شاعری میں مضامینِ تصوّف کا غلبہ ہے۔ ان کے یہاں ایک قسم کی افسردگی پائی جاتی ہے۔ 'نشاطِ روح' اور 'سرودِ زندگی' ان کے شعری مجموعے ہیں۔

آلامِ روزگار کو آساں بنا دیا — جو غم ہوا اسے غمِ جاناں بنا دیا
رند جو ظرف اٹھا لیں وہی ساغر بن جائے — جس جگہ بیٹھ کے پی لیں وہی مے خانہ بنے
چلا جاتا ہوں ہنستا کھیلتا موجِ حوادث سے — اگر آسانیاں ہوں، زندگی دشوار ہو جائے

جگرؔ مرادآبادی (1960-1890): ان کا نام علی سکندر تھا۔ جگرؔ کے والد مولوی علی نظرؔ بھی شاعر تھے۔ جگر کم عمری ہی میں شعر کہنے لگے تھے۔ شروع میں والد سے اصلاح لی۔ پھر داغؔ کے شاگرد ہوئے۔ منشی امیراللہ تسلیمؔ اور اصغرؔ گونڈوی سے بھی مشورۂ سخن کیا۔

جگر کی شاعری میں عشقِ مجازی نمایاں ہے۔ ان کے کلام میں والہانہ پن اور سرمستی کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ آخر عمر میں اصغر گونڈوی کے زیرِ اثر تصوف کی طرف مائل ہو گئے تھے۔ 'داغِ جگر'، 'شعلۂ طور' اور 'آتشِ گل' اُن کے شعری مجموعے ہیں۔ 'آتشِ گل' پر وہ ساہتیہ اکادمی انعام سے نوازے گئے۔ علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی نے انھیں ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری پیش کی تھی۔

جہلِ خرد نے دن یہ دکھائے — گھٹ گئے انساں بڑھ گئے سائے
اللہ اگر توفیق نہ دے انسان کے بس کا کام نہیں — فیضانِ محبت عام سہی، عرفانِ محبت عام نہیں
آنکھوں میں نمی سی ہے چپ چپ سے وہ بیٹھے ہیں — نازک سی نگاہوں میں نازک سا فسانہ ہے
یہ عشق نہیں آساں بس اتنا سمجھ لیجے — اک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے
دل گیا، رونقِ حیات گئی — غم گیا، ساری کائنات گئی

فراقؔ گورکھپوری (1982-1896): ان کا نام رگھوپتی سہائے تھا۔ وہ گورکھپور میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کی زندگی کا بیشتر حصّہ الہ آباد میں گزرا۔ الہٰ آباد یونیورسٹی میں انگریزی کے استاد تھے۔ غزل گو کی حیثیت سے انھوں نے غیر معمولی مقبولیت حاصل کی۔ ہندو دیومالا کے حوالے سے انھوں نے اپنی شاعری کو ایک نیا حسن بخشا۔ انھوں نے ہندی کے شیریں الفاظ بھی بڑی خوب صورتی سے استعمال کیے ہیں۔ وہ ایک منفرد لہجے کے شاعر ہیں۔ انھوں نے تنقیدی

مضامین بھی لکھے اور رباعیاں بھی کہیں۔ 'شعرستان'، 'شبنمستان'، 'روحِ کائنات'، 'گلِ نغمہ' وغیرہ اُن کے مشہور شعری مجموعے ہیں۔ رباعیوں کا مجموعہ 'روپ' بھی بہت مشہور ہے۔ ان کی نثری تصانیف میں 'حاشیے'، 'اندازے'، 'اردو کی عشقیہ شاعری' اور 'اردو غزل گوئی' مشہور ہیں۔ انھوں نے انگریزی اور ہندی میں بھی کئی کتابیں تصنیف کیں۔ ان کا انتقال دہلی میں ہوا۔ آخری رسوم اِلٰہ آباد میں ہوئیں۔

غرض کہ کاٹ دیے زندگی کے دن اے دوست!
وہ تیری یاد میں ہوں یا تجھے بھلانے میں
اس دور میں زندگی بشر کی
بیمار کی رات ہوگئی ہے
بہت پہلے سے ان قدموں کی آہٹ جان لیتے ہیں
تجھے اے زندگی ہم دور سے پہچان لیتے ہیں
اک مدّت سے تری یاد بھی آئی نہ ہمیں
اور ہم بھول گئے ہوں تجھے، ایسا بھی نہیں

شاؔد عارفی (1900/03-1964): ان کا نام احمد علی خاں تھا۔ شاؔد عارفی کا وطن رام پور (یوپی) تھا۔ انھوں نے شاعری کا جو اسلوب اختیار کیا اس میں تیکھے پن، طنز اور تلخی کے عناصر بہت نمایاں ہیں۔ غزل میں ان کا رنگ یگاؔنہ سے مشابہ ہے۔ اس میں شگفتگی اور لطافت سے زیادہ کھردراپن اور بے تکلفی پائی جاتی ہے۔ نئی غزل کے اوّلین نشانات جن شاعروں کے یہاں ملتے ہیں، ان میں شاؔد کا نام بھی شامل ہے۔ زندگی سے ان کا رشتہ ہمیشہ حریفانہ رہا۔ ان کی شاعری میں بھی مزاحمت کا عنصر بہت واضح ہے۔ ان کے مجموعے 'شوخیِ تحریر' اور 'سفینہ چاہیے' جدید شاعری کے نمائندہ مجموعوں میں شامل ہیں۔

جو بھی عِرفانِ مشیّت کا اڑاتے ہیں مذاق
وہ نہ جانے کیا سمجھتے ہیں خدا کی ذات کو
ہاتھ میں جام اٹھانا تو بڑی بات نہیں
کوئی پتھر، کوئی کانٹا رہِ منزل سے اٹھا
تمھیں رہبر سمجھنا پڑ گیا ہے
ہماری بے کسی کی انتہا ہے

اس عہد کے رباعی گو شعرا

رباعی چار مصرعوں کی مختصر نظم ہوتی ہے۔ اس کا پہلا، دوسرا اور چوتھا مصرعہ ایک ہی قافیے میں ہوتا ہے۔ بعض شعرا نے تیسرے مصرعے میں بھی قافیے کا استعمال کیا ہے۔ رباعی میں عام طور پر حکمت اور پند و نصیحت کے موضوعات بیان ہوتے ہیں۔ یہ ایک قدیم صنفِ سخن ہے۔ اردو میں رباعی کہنے کی روایت اسی وقت سے قائم ہے جب دوسری اصناف جیسے غزل، مثنوی اور قصیدہ وغیرہ کہنے کی روایت پڑی۔ ابتدا ہی سے شعرا کے کلام میں رباعیاں مل جاتی ہیں۔ بعض شعرا بالخصوص اپنی رباعی گوئی کی وجہ سے پہچانے جاتے ہیں۔ ان شعرا کی رباعیوں کے مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔

امجؔد حیدرآبادی (1886/88-1961) : ان کا نام سیّد احمد حسین تھا۔ وہ حیدرآباد میں پیدا ہوئے تھے۔ مدرسۂ نظامیہ میں انھوں نے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد پنجاب سے منشی فاضل کا امتحان پاس کیا۔ کچھ عرصے بنگلور میں مدرّس رہے، پھر حیدرآباد لوٹ آئے اور مدرسہ دارالعلوم میں درس و تدریس کی خدمات انجام دیں۔ بعد میں صدر محاسب کے دفتر سے متعلق ہوگئے۔ ان کی وفات حیدرآباد ہی میں ہوئی۔

امجؔد حیدرآبادی صوفیانہ مزاج رکھتے تھے۔ ان کے یہاں اخلاق اور تصوف کے گہرے اثرات ملتے ہیں۔ 'رباعیاتِ امجد' کے نام سے ان کی رباعیات کا مجموعہ تین حصّوں میں شائع ہوا۔ ان کی ایک رباعی ملاحظہ ہو:

شمشیر محبت پہ گلا رہنے دے
ہاں، جان کے ساتھ یہ بلا رہنے دے
امجؔد، شبِ ہجر میں نہ کر بند آنکھیں
وہ آئے گا، دروازہ کھلا رہنے دے

رواؔں اُنّاوی (1889-1934) : ان کا نام جگت موہن لال تھا۔ یہ اناؤ میں پیدا ہوئے۔ رواں بچپن ہی سے بے حد محنتی اور ذہین تھے۔ اُنھوں نے ایم۔اے اور ایل۔ایل۔بی کی ڈگریاں حاصل کرنے کے بعد وکالت کا پیشہ اختیار کیا۔

رواں نے غزل، نظم، مثنوی اور رباعی جیسی اصناف کو اپنے تخلیقی اظہار کا ذریعہ بنایا۔ انھیں شہرت و مقبولیت رباعی گو کی حیثیت سے حاصل ہوئی۔ اُن کی رباعیوں میں فکر و فن کا گہرا امتزاج ملتا ہے۔ معیاری زبان و اسلوب، لطیف تشبیہات و استعارات اور موَثر اندازِ بیان ان کی رباعیوں کی خصوصیات ہیں۔ دو شعری مجموعے 'روحِ رواں'، 'رباعیاتِ رواں' اور ایک مثنوی 'نقدِ رواں' اُن کی یادگار ہیں۔

کیا تم کو بتائیں عمرِ فانی کیا تھی
بچپن کیا چیز تھا جوانی کیا تھی
یہ گل کی مہک تھی، وہ ہوا کا جھونکا
اک موجِ فنا تھی، زندگانی کیا تھی

فراؔق گورکھپوری (1896-1982) : اردو کے رباعی گو شعرا میں بھی فراق گورکھپوری کو نمایاں مقام حاصل ہے۔ ان کی رباعیوں کا مجموعہ 'روپ' کے نام سے شائع ہوا جسے بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس کے علاوہ ان کے شعری مجموعے ''روحِ کائنات'' میں بھی رباعیاں شامل ہیں۔ انھوں نے روایتی مضامین کے ساتھ ساتھ نئے مضامین

سے بھی اردو رباعی کا دامن وسیع کیا۔فراق سے قبل اردو رباعی میں محض پند ونصیحت اور اخلاق سے متعلق موضوعات برتے جاتے تھے لیکن انھوں نے اسے اس تنگ حصار سے نکال کر حسن وعشق اور زندگی کے دیگر پہلوؤں کا ترجمان بنایا۔انھوں نے اپنی رباعیوں کو شرنگاررس کی رباعیاں کہا ہے۔شرنگاررس سے مراد حسن وعشق سے متعلق احساسات و کیفیات کا بیان ہے۔ ؎

عیسیٰ کے نفس میں بھی یہ اعجاز نہیں
تجھ سے چمک اُٹھتی ہے عناصر کی جبیں
اک معجزۂ خموش طرز رفتار
اٹھتے ہیں قدم کہ سانس لیتی ہے زمیں

جوشؔ ملیح آبادی (1898-1982) : جوش ملیح آبادی کو شاعر انقلاب اور شاعر شباب کے نام سے شہرت حاصل ہے۔وہ نظم گو اور مرثیہ گو کے علاوہ رباعی گو شاعر کے طور پر بھی معروف ہیں۔اس صنف میں انھوں نے اختصار اور وضاحت وقطعیت کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ان کی ایک رباعی ملاحظہ ہو :

ہر آن جفا سے قلب ڈر جاتا ہے
ہر بات پر آسماں بپھر جاتا ہے
کرتا ہوں اسے مالِ غنیمت میں شمار
جو لمحہ فراغت سے گزر جاتا ہے